# لبرل ازم: دہریت سے سفاکیت تک

محمد فاروق ناطق

'لبرل ازم' کو ہر اُس خیال، نظریے، عقیدے اور عمل سے دشمنی ہے، جو نفسِ انسانی کی بے لگام آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔ لفظ 'لبرل' انگریزی کے لفظ 'لبرٹی' (Liberty: یعنی مطلق آزادی و خودمختاری) اور لاطینی لفظ 'لائبر' (آزاد و خودمختار) سے ماخوذ ہے۔ اب یہ لفظ ایک مستقل اصطلاح کی حیثیت سے خدا اور نفسِ مذہب سے مطلق آزادی کی علامت بن چکا ہے۔

یورپی معاشرے میں عیسائی مذہبی رہنماؤں کی جانب سے سیکڑوں برس تک مذہب کی غلط اور خودساختہ تشریح، مذہب کے غلط استعمال اور اس کی بنیاد پر عوام کے استحصال کے خلاف چودھویں صدی عیسوی میں شدید منفی ردِّعمل پیدا ہوا، جس کی بنیاد پر ایک تحریک برپا ہوئی۔ اس تحریک کے فکری رہنماؤں نے جو آبائی طور پر خود بھی عیسائی تھے، دینِ عیسٰیؑ میں دَر آنے والے بگاڑ کی اصلاح کرنے کے بجاے خود دینِ عیسوی ہی کو رد کر دیا اور معاشرتی اقدار، قوانین اور اخلاقیات کی تشکیل کے عمل سے دینِ عیسوی کو بے دخل کر دیا۔ عیسائیت کی گرفت کمزور پڑنے سے یورپی عوام میں فکری خلا پیدا ہوا، جسے پُر کرنے کے لیے انسانوں کے خودساختہ اور متفرق خیالات نے جگہ بنالی۔ مذہب سے باغی ان یورپی لوگوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کو تاراج کر کے وہاں حکومتیں قائم کیں تو اپنے لبرل نظریات ہی کو مقبوضہ معاشروں کی تشکیلِ نو کی بنیاد بنایا۔ مقبوضہ مسلم ممالک کے کچھ مسلمان بھی لبرل ازم سے متاثر ہوئے اور اس کے نقیب بن گئے۔

عیسائیت ہی نہیں بلکہ چین کے تاؤازم اور کنفیوشس ازم، جاپان کے شنٹوازم اور بدھ مت اور ہندستان کے ہندومت لبرل ازم کے سامنے غیرمؤثر ہو چکے ہیں۔ مشرقِ بعید میں پھیلے ہوئے

بدھ مت اور نسل پرست یہودیت سمیت تمام مذاہب جو کہ اپنی ساخت و ہیئت کے اعتبار سے معاشرے کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیل میں پہلے بھی کوئی بہت سرگرم کردار نہیں رکھتے تھے، پچھلے ۶۰ برسوں میں لبرل ازم کے فکری طُوفانِ بدتمیزی کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے ہیں اور ریاستی و معاشرتی اُمور میں رہنمائی سے کُلّی طور پر دست بردار ہو چکے ہیں۔ ایک دینِ اسلام ہے جو اپنی فکری بنیاد کی مضبوطی کے سبب میدان میں قوت کے ساتھ موجود ہے۔ اسی لیے تمام لبرل قوتوں کا نشانہ بھی اس وقت دین اسلام اور وہ مسلمان ہیں جو دین اسلام کو اس کی اصل شکل میں اس کی روح کے ساتھ قائم کرنا اور قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

● **لبرل ازم: دھریت کا مقدمہ**: امریکا اور یورپ میں لبرل ازم کے سرخیل، ملحد اور دہریے (atheist یا agnostic) ہیں۔ لبرل ازم اصل میں الحاد اور دہریت کا مقدمہ ہے بلکہ اب تو خود ایک دین ہے اور ایک لبرل شخص ممکنہ طور پر (potentially) ایک ملحد اور 'دہریہ' ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا اور مذہب سے آزادی اور مذہب میں قطع و برید کی خواہش پہلے عملی اور بالآخر نظری طور پر خدا کے انکار ہی پر منتج ہوتی ہے۔ کوئی سرکاری مذہب نہ رکھنے والے ممالک (مثلاً سکینڈے نیویا، جرمنی، ہالینڈ، مشرقی ایشیا اور چین) میں دہریہ کہلانے والے افراد کی تعداد میں پچھلے چند برسوں میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکا میں ان کی تعداد ۵ فی صد ہے۔ گیلپ انٹرنیشنل کے سروے کے مطابق دنیا کے ۶۵ ممالک کے ۱۱ فی صد افراد نے دہریت کو اختیار کیا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ لبرل لوگ جس مذہب سے متعلق ہوتے ہیں، سب سے پہلے اسی کی بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔ اُس کے شعائر کا مذاق اُڑاتے ہیں اور اُس دین کے علم برداروں کی تضحیک اور کئی صورتوں میں ریاستی طاقت اور وسائل کے بل پر ان کے قتل تک کے درپے ہوتے ہیں۔

● **تخلیقِ کائنات کی سائنسی ترجیح**: مغربی ممالک کے لبرل خواتین و حضرات کہتے ہیں کہ: ''چوں کہ سائنسی طور پر خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ثابت ہوا کہ کائنات کی تخلیق بغیر کسی خالق کے خود بخود ہوئی تھی۔ حالاں کہ سائنس خود اس بات کی دعوے دار ہے کہ عدم سے کسی چیز کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ایک عرصے تک سائنس دان بھی قدیم یونانی لوگوں کی طرح کہتے رہے کہ مادّہ کو فنا نہیں اور یہ کہ مادّہ غیر متبدّل چیز ہے۔ لیکن اب عرصہ ہوا قانونِ بقاے مادّہ

(Law of Conservation of Mass یا Law of Indestructibility of Matter) متروک ہو چکا ہے۔اب سائنسی عقیدہ یہ ہے کہ مادّہ (matter) توانائی میں تبدیل ہوسکتا ہے اور توانائی مادّے میں بھی ڈھل سکتی ہے۔ایڈون ہبل (ہبل خلائی دوربین کے موجد) اور اس کے ہم عصر سائنس دانوں نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء کے عرصے میں تحقیق کے بعد دعویٰ کیا کہ: ''لگ بھگ ۱۴ارب سال پہلے اس کائنات کا وجود ایک انتہائی کثیف (highly dense) اور انتہائی گرم مادّہ کی شکل میں ایک جگہ پر مرتکز تھا۔پھر خود بخود ایک دھما کا اس مرتکز مادّہ میں ہوا اور اس کے ٹکڑے چاروں طرف پھیل گئے (سائنسی دنیا میں اسے 'بگ بینگ تھیوری' کہتے ہیں)۔یہی ٹکڑے کائناتی اجساد و اجسام (cosmic bodies) کی شکل میں ڈھل کر آج ہمارے سامنے کائنات کی شکل میں موجود ہیں۔کائنات کی تشکیل سے متعلق یہ 'خود بخود' کا نظریہ تو خود سائنس کے بنیادی دعوے کی نفی ہے۔اس نظریے میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ 'بگ بینگ' سے قبل موجود اور مرتکز کثیف اور گرم مادّہ کہاں سے آیا؟ کب سے موجود تھا اور اس میں دھما کا کس سبب سے ہوا؟

'بگ بینگ تھیوری' کی بنیاد پر یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ: ''چوں کہ یہ کائنات ایک مرتکز نکتے میں دھماکے کے نتیجے میں بنی ہے، اس لیے اس کے اجسام و اجساد نہایت تیز رفتاری سے ایک دوسرے سے دُور ہوتے ہوئے خلا میں پھیلتے جا رہے ہیں اور یہ کائنات وسعت پذیر ہے''۔اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ متحرک اور دم بدم پھیلتی ہوئی کائنات اپنا ایک انتہائی آخری کنارہ ضرور رکھتی ہے اور اس تیزی سے سفر کرتے ہوئے کنارے سے آگے محض خلا ہے۔کیا کوئی جانتا ہے کہ کائناتی وقت کی ابتدا کیا ہے اور اس کی انتہا کیا ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ وقت اور خلا کو ناپنے کا انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔کائناتی فاصلوں کو ناپنے کے لیے انسان کے معروف پیمانے ناکام ہو چکے ہیں۔ حالاں کہ ابھی انسان نے شاید کائنات کا ایک معمولی سا حصہ بھی مکمل طور پر دریافت نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خود اس پھیلتی ہوئی لیکن بہرحال محدود کائنات کا حصہ ہے۔

● **عقلی اور منطقی رویہ:** تخلیقِ کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کیا وہ

لوگ جنھوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جُدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلّاقی کو) نہیں مانتے'' (الانبیاء ۲۱:۳۰)۔ یہ کائنات محدود ہوتے ہوئے بھی ایک بہت بڑا کُل ہے اور زندگی اس بڑے کُل کا ایک چھوٹا سا جُز ہے۔ انسان یقیناً اس محسوس و محدود (تیزی سے پھیلتی ہوئی اور متحرّک) کائنات کا حصہ ہے اور اپنے اردگرد کا سائنسی مشاہدہ و تجزیہ کرسکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے، لیکن وہ اس کائنات کو اس انداز سے دیکھنے اور اس کا تجزیہ کرنے پر قادر نہیں ہے، گویا وہ اس کائنات سے باہر بیٹھا ہے۔ کائنات کی اصل کو جاننے اور اس کے اندر پیدا ہونے والی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک ایسے خدا کو ماننا ناگزیر ہے جو خود اس کائنات کا حصہ نہ ہو بلکہ اس سب کا خالق و موجد ہو، جیسا کہ الہامی مذاہب کی تعلیم ہے۔ ایسے ہمہ گیر، طاقت ور اور خالق خدا کی ماہیت کے بارے میں سوال کرنا، یعنی اُس کی کُنہ دریافت کرنا یا اسے اپنے حواسِ خمسہ اور معروف انسانی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرنا ہی غیر عقلی اور غیر منطقی بات ہے۔ ایک مخلوق اپنے خالق کی ماہیت کیسے دریافت کرسکتی ہے؟ البتہ اُس خالق کی موجودگی کی بے شمار نشانیاں ہمارے اردگرد موجود ہیں، اور انسانوں کی عظیم ترین اکثریت قدیم سے جدید زمانے تک اس کی قائل ہے کہ دنیا میں موجود اشیا کی تخلیق اور اس تخلیق کے اندر پایا جانے والا حُسن اور نظم و ضبط ایک ہمہ گیر، طاقت ور اور خلّاق خدا کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ انسان جنھوں نے خدا کے وجود سے انکار کیا ہے، اس کائنات کی تشکیل اور اس میں زندگی کی آمد اور اس کی تشریح و توجیہہ کرنے کے لیے اپنی عقل پر انحصار کرنا اُن کی مجبوری بن چکی ہے۔ کائنات کی تشکیل اور زمین پر زندگی آمد و نمو سے متعلق دعوے کرتے وقت انسانی عقل کا حال تو اُس ۱۰ سالہ بچے کا ہے، جو آئن سٹائن کے نظریۂ نسبتیت (Theory of Relativity) کو سمجھنے کا دعویٰ کرے۔ جو لوگ خدا کے وجود کو نہیں مانتے وہ زمین پر زندگی کی آمد و نمو کی تشریح کرنے کے لیے چاروناچار ڈاروِنزم پر ایمان لاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمام زندہ مخلوقات، غیر ذی حیات نامیاتی مادوں سے، بغیر کسی خالق کے، ایک پیچیدہ مگر منظّم کیمیائی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ لگ بھگ تین ارب سال قبل زمین پر موجود ماحول اور درجۂ حرارت میں پائی جانے والی

موزونیت کے باعث خود بخود ایک خلیہ ایسا ظہور پذیر ہوا، جس نے اردگرد کے ماحول، اپنی بقا کی ضروریات اور اپنے وجود کے تسلسل کی خاطر خود کو آپ ہی آپ ٹُوٹ پھُوٹ (mutation) اور ناگہانی تغیر اور تبدیلی کے عمل سے گزارا اور نئی نئی حیاتیاتی اکائیوں میں ڈھلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ایک شاخ پہلے بندر اور پھر انسان کی شکل میں ڈھل گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام تر سائنسی کوششوں اور ابلاغی دعووں کا ڈھول پیٹنے کے باوجود دہریت اور ڈارون ازم کسی طور پر ثابت شدہ نظریات نہیں ہیں۔ اس ضمن میں دسیوں مختلف اور متضاد تھیوریاں یورپ اور امریکا کی سائنسی اور علمی دنیا میں گردش کر رہی ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ نظریہ، نفس پرست لبرل خواتین وحضرات کے کام کی چیز ہے، اس لیے وہ اس کا پرچار ایک 'ثابت شدہ' حقیقت کے طور پر کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ برگزیدہ اور نیک نام لوگ ہیں، جو ایک اَن دیکھے خدا پر یقین رکھتے تھے اور خود کو اُس خدا کا پیغامبر کہتے تھے۔ یہ لوگ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کی اور نہ انھوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ سب اس کائنات کے لیے ایک خالق ہونے کی بات کرتے تھے۔

یہ بات سائنسی طور پر ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حیاتیاتی تشکیل ایک نہایت پیچیدہ لیکن بہت ہی منظّم عمل ہے اور کوئی بھی منظّم عمل ایک عامل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ: ''اگر خدا ہے تو اس خدا کو کس نے بنایا؟'' ان سے انھی کی زبان میں ایک سادہ سا سوال ہے کہ جب تم خدا کی پیدایش کے لیے ایک اور خالق کا سوال کرتے ہو، تو بتاؤ کہ ایک غیر ذی حیات نامیاتی وجود اپنی تشکیلِ نو اور خود کو حیاتیاتی وجود میں ڈھالنے کے لیے، بغیر کسی خارجی عامل کی مداخلت کے، ایک شعوری (ذی عقل) اور انتہائی منظّم عمل کیسے کر پاتا ہے؟ کیا کسی بھی منطقی اور سائنسی قاعدے کی رو سے اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟''

● **حقیقت سے فرار**: جب ایک لبرل یا دہریہ فرد یہ کہتا ہے کہ: ''مذہب انسان کی آزادی کو ختم یا محدود کر دیتا ہے''، تو دراصل وہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ 'خدا' انسانوں کا خود سے گھڑا ہوا ایک خیالی وجود ہے اور اس خیالی وجود نے انسانوں کی آزادی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اس قید یا یرغمالی کیفیت سے خود کو اور دوسرے انسانوں کو نکالنے کے لیے ہم یہ لبرل خواتین وحضرات کوشش کر رہے ہیں۔

تاہم، جو بات یہ لبرل خواتین وحضرات سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ حیاتیاتی طور پر (biologically) انسان ایک حیوانی وجود ہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہرحال ایک اخلاقی وجود بھی ہے اور یہی اس کی اصل پہچان ہے۔ایک انسان کے اندر پائی جانے والی صحیح اور غلط کو پہچاننے اور ان میں سے کسی ایک کو اختیار یا رد کرنے کی جبلّی صلاحیت اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے۔ایک بڑا فرق حیوان اور انسان میں یہ ہے کہ انسان اپنے اردگرد کو پہچانتا ہے، اس کا گہرا شعور رکھتا ہے اور اپنی ذات کو پہچاننے اور اسے نمایاں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انسان اشیا کا تجزیہ کرنے اور ان کے باہمی تعامل کو سمجھنے کی پیدایشی صلاحیت رکھتا ہے اور یقیناً یہ صلاحیت حیوانات میں نہیں ہے۔انسانوں کی یہ پیدایشی صلاحیتیں اُس کے بچپن سے جوانی تک بتدریج نمو پاتی ہیں، لیکن جانوروں میں ایسی تدریج کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔جبلّی طور پر انسان میں پایا جانے والا 'ضمیر' یہ قوّت رکھتا ہے کہ کسی قسم کے خارجی دباؤ یا قانون کے بغیر حیوانی خواہش پر قابو پا کر کسی بھی غلط کام سے انسان کو روک لے۔اس کے برعکس حیوانوں میں ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

دنیا کے تمام نظام ہاے حکومت کی طرح دینِ اسلام میں بھی قانون کے نفاذ کے ذریعے برائی کے خاتمے اور اس کی روک تھام کا اہتمام موجود ہے، لیکن اس دین کا انحصار اصل میں ان اخلاقی اقدار کو اپنانے پر ہے، جو انسانی ضمیر کی مطابقت میں انسانوں کے خالق نے عطا کی ہیں۔ دنیا میں اس وقت پائی جانے والی تمام اخلاقی اقدار کسی بندر یا انسان نما حیوان نے نہیں بنائی ہیں۔ یہ تمام اقدار الہامی مذاہب کی عطا کردہ ہیں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اخلاقی اقدار کے معاملے میں تاریخ کے مختلف ادوار میں ظاہر ہونے والے پیغمبرانِ خدا یکساں اور مشترک ورثہ انسانوں کو دے کر گئے ہیں۔ان تمام پیغمبروں نے قانون سے زیادہ اخلاقی اقدار اور ضمیر کی پکار پر توجہ دینے کی تعلیم دی، اگرچہ ناگزیر صورتِ حال میں تعزیر کا استعمال بھی تجویز کیا۔

پیغمبرؐ اسلام کے ابتدائی ساتھیوں اور اسلامی تاریخ کی دیگر شخصیات کی بے شمار مثالوں کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کسی قسم کی قانونی قدغن یا سزا کے خوف کے بغیر محض اپنے ضمیر اور خدا اور آخرت کے دن پر یقین رکھنے کے باعث زبردست اندرونی ڈسپلن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

سچے مسلمان آج بھی انھی اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ابھی تک مسلمان ملکوں میں جرائم کا تناسب لبرل ممالک کی نسبت بہت کم ہے اور اس کی وجہ مسلمانوں کا وہ اندرونی ڈسپلن ہے جو دینِ اسلام کی وجہ سے قائم ہے۔جن ممالک میں جرائم کی شرح زیادہ ہے، وہ جرائم پر قابو پانے کے لیے مزید قوانین متعارف کراتے ہیں اورنفاذِ قانون کے لیے مزید انسانی و دیگر وسائل فراہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ اُن معاشروں میں مذاہب کی گرفت کمزور ہونے کے باعث خود احتسابی کا عنصر ناپید ہو رہا ہے۔جن ممالک میں مذہب اور ریاست کو جدا جدا کر دیا گیا ہے اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم حکومتوں کی ذمہ داری نہیں رہی ہے، اُن کے پاس کوئی راستہ ہی اس کے سوا نہیں بچا کہ وہ جرائم کی روک تھام صرف اور صرف قوت سے کریں۔

آپ ایک جنگل کا تصور کریں، جس میں حیوانات بالکل آزاد گھوم رہے ہیں اور اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے کا شکار کر رہے ہیں۔ایک شکاری جانور کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے، یعنی اپنی بھوک مٹانا۔ یہ کسی نوعیت کی اخلاقی حس نہیں رکھتا۔شیروں کا ایک بڑا جتھا یا قبیلہ کسی جنگل میں جمع ہو کر اپنے دفاع اور بقا کے لیے جدو جہد کرتا ہے۔ یہ شیر بھی باہم مل جل کر رہتے ہیں اور ایک حد تک ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔لیکن جب معاملہ دوسرے حیوانات کا ہو تو یہ شیر صرف اور صرف اپنے مفاد، یعنی پیٹ بھرنے ہی پر اپنی توجہ اور توانائی مرکوز کرتے ہیں۔وہ کسی دوسرے حیوان کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے کیوں کہ وہ کوئی اخلاقی حس نہیں رکھتے ہیں۔دل چسپ بات یہ ہے کہ ڈارون ازم کے مطابق: ''انسان نرا حیوان ہی ہے''۔

اب آپ لبرل کہلانے والے ملکوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پچھلے تقریباً ۲۰۰ برس سے دنیا کو ایک جنگل بنا رکھا ہے۔اپنے قومی اور گروہی مفادات کے حصول کے لیے یورپ کے ممالک اور امریکا نے نہایت سفّاکی سے جتنی بڑی تعداد میں انسانوں کو قتل کیا ہے وہ پوری انسانی تاریخ میں قتل ہونے والے انسانوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ یورپی اقوام نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے وسائل پر قبضے کے لیے کیے گئے حملوں کے دوران بلا مبالغہ کروڑوں لوگوں کو قتل کیا۔فرانس نے ۱۸۳۰ء-۱۸۴۷ء کے دوران انسانوں سمیت ہر اُس چیز کو الجزائر میں تباہ کر دیا جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔لاکھوں خواتین کی آبروریزی کی گئی اور لاکھوں

انسانوں کا قتل عام کیا گیا۔ امریکیوں نے (جو اصلاً یورپ سے نقل مکانی کر کے گئے ہوئے لوگ ہیں) براعظم امریکا کے اصل باشندوں ریڈ انڈین کے قتلِ عام سے آغاز کیا اور لاکھوں مقامی لوگوں کا نام ونشان مٹادیا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں طاقت کے بے دریغ استعمال سے ثابت ہوا کہ لبرل لوگ اپنے تحفظ کے لیے اقدام کرتے وقت کسی بھی خونخوار حیوان ہی کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں امریکی ایٹمی حملوں کے نتیجے میں جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگ مارے گئے، لاکھوں زخمی اور تابکاری اثرات سے بیمار ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم [۱۸-۱۹۱۴ء] کے دوران پونے دو کروڑ اور دوسری جنگِ عظیم [۴۵-۱۹۳۹ء] کی آگ میں انھی لبرل قوموں نے ۶ تا ۸ کروڑ لوگ ہلاک کیے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل کے قوانین موجود ہونے کے باوجود امریکا نے ویت نام پر حملہ کیا اور ۲۰ سالہ جنگ [یکم نومبر ۱۹۵۵ء-۳۰/اپریل ۱۹۷۵ء] میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ سابق سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے نتیجے میں ۱۵ لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ عراق پر امریکی حملے کے نتیجے میں اب تک ۵ لاکھ اور شام کی جنگ میں تقریباً ۲ لاکھ سے زیادہ انسان مارے جا چکے ہیں___ کیا گذشتہ ۲۰۰ برس کی تاریخ سے یہ سبق حاصل نہیں ہوتا کہ جب انسان خدا فراموش ہو جائے اور مذہب کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو اُس کا رویّہ ایک وحشی حیوان کا سا ہو جاتا ہے؟

مقامِ حیرت ہے کہ پچھلے ۲۰۰ برس میں اتنا ظلم ڈھانے کے بعد بھی یہ لوگ انسانیت کے قائد کہلانے کے دعوے دار ہیں، اور دنیا کو ایک نئی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں، اور اپنے مخالفین کو 'بنیاد پرست'، 'انتہاپسند' اور 'دہشت گرد' کے القاب سے نوازتے ہیں!

لبرل ازم کے علَم بردار عموماً مذہبی شعائر اور بالخصوص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے لیے اپنی وضع کردہ 'آزادی رائے' کو آڑ بناتے ہیں۔ دوسری طرف لبرل حکومتیں توہینِ عدالت پر تو سزا دیتی ہیں لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ کیا یہ دُہرا معیار نہیں۔ کیا یہ مبنی برانصاف ہے؟